شمس الرحمٰن فاروقی

تمہید

محمد حسن عسکری نے ایک تقریر میں بڑی عمدہ بات کہی تھی کہ "لوگوں نے اردو کے ہر بڑے شاعر کی عظمت سے انکار کیا ہے، مگر میر کا منکر ڈھونڈے سے ہی ملے تو ملے"۔ انھوں نے اس بات کو آگے نہیں بڑھایا، ورنہ وہ اس سوال تک ضرور پہنچتے کہ ایسا کیوں ہے؟ میر میں ایسی کون سی خاص بات ہے کہ ناسخ کی طرح سب ہی کہتے ہیں کہ ؎

شبہ ناسخ ہے کسے میر کی استادی میں　　آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

(خیال رہے کہ یہ مضمون، کہ سبھی میری استادی کے قائل ہیں، میر کا ہے ؎

ریختہ رتبے کو پہنچایا ہوا اس کا ہے　　معتقد کون نہیں میر کی استادی کا

یعنی میر کی عظمت کے معاملے میں سبھی لوگ میر کے ہم خیال ہیں)۔ اگر یہ کہا جائے کہ میر کی عظمت سے کسی نے انکار اس لیے نہیں کیا کہ انھیں خداے سخن کہا جاتا ہے، تو یہ استدلال سراسر دوری (Circular) ہے، کیونکہ اسی بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ میر کو خداے سخن کہتے ہیں اس لیے کسی نے ان کی عظمت سے انکار نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ دونوں بیانات محتاج ثبوت ہیں اور ان میں دعوے کو دلیل سمجھ لیا گیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ میر کا کلام ہر زمانے میں مقبول رہا ہے، تو بھی کوئی دلیل نہیں بنتی۔ مقبول تو ان شعرا کا بھی کلام رہا ہے، اور ہے، جن کی عظمت کے منکرین بھی موجود رہے ہیں۔ مثلاً اقبال کے کلام کی مقبولیت میں کوئی شک نہیں، لیکن ان کے منکرین ہر زمانے میں رہے ہیں، کبھی اکادکا اور کبھی کثیر تعداد میں۔

جس تقریر کا میں نے ابھی ذکر کیا، اس میں محمد حسن عسکری نے اردو غزل اور فارسی غزل کے حوالے سے کچھ بہت بنیادی باتیں کہی تھیں۔ ان پر غور کیا جائے تو شاید اس سوال کا جواب ڈھونڈنے میں مدد ملے کہ میر کی عظمت کا اقرار سبھی نے کیا تو کیوں کیا۔

یہاں سب سے پہلا نکتہ تو یہ ہے کہ اردو غزل نے فارسی غزل کی مکمل تقلید نہیں کی، یعنی اردو کی غزل کو فارسی کی غزل کا محض تتمہ یا ضمیمہ نہ سمجھنا چاہیے۔ اس غلط رجحان کی ابتدا اٹھارویں صدی کی دلی میں فارسی پرستی کے جوش کے باعث پڑی بلکہ ایک مدت تک تو دلی والوں نے "ریختہ" اور "غزل" میں فرق کیا، یعنی "غزل" سے وہ مراد لیتے تھے فارسی غزل، اور ہندی (یعنی آج کے معنی میں اردو) غزل کو وہ "ریختہ" سے تعبیر کرتے تھے۔ چنانچہ قائم چاندپوری کے مشہور، بلکہ صحیح معنوں میں بدنام شعر میں "غزل" اور "ریختہ" کا وہی مطلب ہے جو میں نے اوپر بیان کیا ؎

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ　　اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

قائم کے اس شعر کی تاریخ متعین کرنا مشکل ہے، اغلب ہے کہ یہ شعر ۱۷۵۰ تا ۱۷۶۰ کی دہائی میں کہا گیا ہو۔ مصحفی کا

مندرجہ ذیل شعر ان کے آٹھویں دیوان میں ہے جس کی تاریخ ۱۸۲۰ کے کچھ بعد کی متعین کی گئی ہے۔ (مصحفی کا انتقال ۱۸۲۴ میں ہوا)۔

مصحفی ریختہ کہتا ہوں میں بہتر ز غزل　　معتقد اب کوئی کیوں سعدی و خسرو کا ہو

مصحفی کے اس مقطعے سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ انیسویں صدی کی پہلی دہائی تک بھی دلی والے فارسی کی ہی غزل کو "غزل" کے نام سے سرفراز کرتے تھے۔ لیکن مصحفی کے شعر میں خودستائی اور در مدح خود کے علاوہ ایک طرح کی شکایت بھی ہے کہ یار لوگ اب بھی اردو کو نقلی اور فارسی کو اصلی مال قرار دے رہے ہیں، جبکہ میں نے "ریختہ" کو فارسی سے بڑھا دیا ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی خاطرنشیں رہے کہ یہاں وہ دو نام لاتے ہیں (سعدی و خسرو)، یہ دونوں فارسی کے مسلم الثبوت بڑے شاعر ہیں، لیکن ان میں سے ایک ہندوستانی ہے، یعنی وہ یہ بھی کہنا چاہتے ہیں کہ "غزل" (یعنی فارسی غزل) بھی ساری کی ساری ایرانیوں کی جاگیر نہیں ہے۔

بہرحال، مصحفی کا آٹھواں دیوان مدت مدید تک عرصۂ خفا میں رہا، اور لوگوں کو یہ بات نہ معلوم ہوسکی کہ مصحفی نے خود کو سعدی و خسرو سے بڑھ کر بتانے میں صرف ڈینگ نہیں ہانکی تھی، بلکہ میر کی پچھتر برس پرانی بات کا جواب بھی دیا تھا کہ ریختہ کی شاعری وہ شاعری ہے جو زبان اردوے معلاے شاہجہاں آباد میں ہو، اور بطرز فارسی ہو۔ یعنی مصحفی یہ کہہ رہے تھے کہ ہم (ریختہ والوں) نے اپنی راہ الگ نکالی ہے، یا کم سے کم اپنا تشخص الگ قائم کیا ہے، ہم فارسی کا دم چھلا نہیں ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ مصحفی کا یہ دیوان اور ان کا یہ شعر اگر متداول بھی ہوجاتا تو ہم لوگوں کو کچھ فرق نہ پڑتا۔ یہ بات ہماری تنقید میں کسی نہ کسی مفہوم میں بہرحال عام رہی ہے کہ اردو کی غزل محض "ریختہ" (پڑی گری) ہے جب تک وہ "غزل طور" (فارسی کے طرز و انداز کی) نہ ہو۔ محمد حسن عسکری اسی غلط رائے کے خلاف ہمیں متنبہ کر رہے تھے جب انھوں نے متذکرہ بالا تقریر میں کہا کہ اردو شاعری نے فارسی کی آواز سے آواز نہیں ملائی، اور "ممکن ہے یہ مجبوری یا ناکامی بھی ہو، لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہمارے شاعروں نے آواز سے آواز ملانے کی پوری کوشش ہی نہ کی ہو"۔ یہ بھی ملحوظ رکھیے کہ عسکری جب "آواز سے آواز ملانے" کی بات کرتے ہیں تو وہ فارسی کے مضامین، استعاروں اور تلمیحات کی بات نہیں کرتے۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ اوپری چیزیں ہیں۔ یونانی المیہ کی ظاہری رسومیات کی سخت پابندی کے باوجود ملٹن نے "شمسون مبارز" (Samson Agonistes) کے روپ میں انگریزی ہی ڈراما تخلیق کیا۔ یونانی تو شاید اسے ڈراما ہی نہ تسلیم کرتے۔ اور یونانی مضامین اور استعاروں کو استعمال کر کے ٹامس گرے (Thomas Gray) کی "بطرز پنڈار" نظمیں (Pindaric Odes) یونانی نہیں ہوگئیں۔ لہٰذا وہ اردو اور فارسی شاعری کی بنیادی روح میں اختلاف کی بات کرتے ہیں۔ عسکری کہتے ہیں کہ اردو کے ادیب "کی روحانی کاوش کا مرکز دوسرا تھا"۔

اس نکتے کی تفصیل عسکری نے ان الفاظ میں لکھی ہے: "اردو شاعری اور اردو نثر دونوں میں روزمرہ کی معمولی زندگی کا احساس بہت قوی ہے۔ اس کی شہادت میر، مصحفی، درد کے کلام میں مل سکتی ہے اور "باغ و بہار" اور "طلسم ہوش ربا" میں بھی... روزمرہ کی زندگی کے احساس سے پیچھا چھڑانا ان کے بس کی بات نہ تھی... خالص جذبے کو اپنانا ان سے ممکن نہیں تھا۔ وہ جذبے کو اس کے دور دراز مناسبات، متعلقات اور پس منظر سے الگ نہیں کر سکتے"۔ دوسرے الفاظ میں، اردو کا شاعر رسومیات کا کتنا ہی پابند کیوں نہ ہو اور لگے بندھے مضامین میں نئے نئے پیوند اور پہلو لگانے کا کتنا ہی شائق ہو، لیکن وہ دنیا

کو، اس کی بظاہر معمولی چیزوں کو بھی وہی اہمیت دیتا ہے جو بالعموم مابعد الطبیعیاتی، ماورائی یا ''آفاقی'' چیزوں کے لیے مختص رکھی جاتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب تیسرے درجے کی اضافیت (Relativism) نہیں، کہ تمام چیزیں برابر ہیں، صحت اور اہمیت کے اعتبار سے ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر خوب ہے۔ آپ بھی ٹھیک ہم بھی ٹھیک، چلیے جھگڑا ختم ہوا۔ یہ رویہ تو دیوالیہ پن یا بددیانتی کا آئینہ دار ہے۔ ''معمولی'' باتوں سے بھی بڑے بڑے نتائج نکالے جاسکتے ہیں، اور بعض اوقات ''بڑی'' باتوں کے معنی اس وقت ظاہر ہوتے ہیں جب انھیں معمولی، روزمرہ زندگی میں اٹھنے والی، چھوٹی موٹی اشیا و کوائف کے تناظر میں رکھا جائے۔

میر کے دیوان اول سے حسب ذیل شعر محمد حسن عسکری نے اپنے ایک اور مضمون (مطبوعہ ۱۹۴۷) میں نقل کیا ہے۔

جب رونے بیٹھتا ہوں تب کیا کسر رہے ہے رومال دو دو دن تک جوں ابرتر رہے ہے

عسکری صاحب نے اس شعر کے بارے میں لکھا ہے کہ ایسا شعر تخیل اور شعریت کی انتہائی بلندیوں ہی پر پہنچ کر کہا جاسکتا ہے اور اس شعر میں جو المیہ ہے وہ رونے کے ذکر سے نہیں، بلکہ رومال کے ذکر سے ہے۔ بات بالکل صحیح ہے، لیکن عسکری صاحب اس بات کو شاید نظر انداز کر گئے تھے کہ رومال کا مضمون میر سے بہت پہلے ولی باندھ چکے تھے۔ ولی کا شعر ہے۔

نہ پوچھو عشق میں جوش و خروش دل کی ماہیت برنگ ابر دریابار ہے رومال عاشق کا

اس میں کوئی شک نہیں کہ میر کا شعر ولی کے شعر سے بڑھا ہوا ہے۔ ولی نے مضمون نیا نکالا، پھر بہت سجا کر شعر کہا۔ مناسبت الفاظ غضب کی ہے: جوش، خروش، ماہیت، رنگ، ابر، دریا، دریابار، تمام لفظ آپس میں گتھے ہوئے ہیں اور معنی و انسلاکات کی نئی دنیائیں ہمارے سامنے لا رہے ہیں۔ لیکن ولی کو اولیت کا شرف ہونے کے باوجود ان کے شعر میں وہ انسانی پہلو نہیں ہے جس نے میر کے شعر کو اس قدر بلند رتبہ کر دیا ہے۔ بجا کہ رومال کا مضمون ولی نے دریافت کیا، لیکن رومال کا ابر دریابار کے رنگوں تر دکھانا رسومیاتی معاملے کو مبالغے یعنی استعارے کے عالم میں ڈال دینا ہے۔ یہ بجائے خود ایک کارنامہ ہے، لیکن میر اس سے بڑا کارنامہ انجام دیتے ہیں کہ استعارے کے عالم کو روزمرہ کے عالم میں ڈال دیتے ہیں۔ رومال کا ''دو دو دن تک'' تر رہنا کس قدر گھریلو اور مانوس بیان ہے۔ مبالغہ ہے لیکن مبالغہ معلوم نہیں ہوتا، خاص کر جب ''رونے بیٹھتا ہوں'' کہا جارہا ہے۔ یعنی جہاں بہت سے کام ہیں وہاں رونا بھی ایک کام ہے۔ کبھی ہم کوئی کام انجام دیتے ہیں، کبھی کوئی کام کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ انسانی المیے کی وہ منزل ہے جہاں عاشق کی ناکامیاں اور مایوسیاں دنیا کے روزمرہ، عام، بلکہ عامیانہ کاموں میں گھل مل جاتی ہیں، حل ہوجاتی ہیں۔ یہ کوئی چھپ چھپ کے رونا نہیں ہے جو حسرت موہانی نے ہمیں سکھایا تھا۔ میر جس دنیا سے ہمیں روشناس کراتے ہیں وہاں عشق زندگی کی ظاہر و باہر حقیقت ہے۔ یہاں عشق ایسا کام نہیں جو شرمندہ ہونے یا احساس گناہ میں مبتلا ہو کر گھٹ گھٹ کر مرنے پر مجبور کرے۔

مندرجہ بالا تجزیے کی روشنی میں دیکھیں تو میر کے رونے میں مقامی اور آفاقی حقیقتیں ایک ہونے لگتی ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار پر غور کریں۔

کہاں تک بھلا روؤگے میر صاحب اب آنکھوں کے گرد اک ورم دیکھتے ہیں

آنکھوں نے میر صاحب و قبلہ ورم کیا   حضرت بکا کیا ۔ کرو رات کے تئیں
بکاے شب و روز اب چھوڑ میر   نواح آنکھوں کا تو ورم کر گیا

آخری شعر کے ساتھ اسی غزل کا یہ شعر بھی دھیان میں رکھیں تو معلوم ہوگا کہ میر نے عشق کی حقیقت کو عام انسان کی دسترس سے کس قدر نزدیک کردیا ہے۔

مرے مزرع زرد پر شکر ہے   کل اک ابر آیا کرم کر گیا

عشق ایسا تجربہ ہے، بلکہ ایسی زندگی ہے جو معمولی معمولی سینکڑوں زندگیوں پر بھاری ہے۔ اس کے نشیب و فراز، اس کے بلند و پست، اس کا قبض و انبساط، یہ سب کئی کئی تجربات و حوادث کے آئینہ ہیں۔ لیکن انسان ہی یہ عشق جھیلتے اور جھوگتے ہیں، فرشتوں کا یہ کام نہیں۔ عشق انسانی حقیقت ہے، اور میر اسے انسان کی طرح برتتے اور اسی میں جیتے اور مرتے ہیں۔ اوپر جو شعر میں نے نقل کیا ہے، اس کے ٹھیک اوپر مندرجۂ ذیل شعر ہے۔

شب اک شعلہ دل سے ہوا تھا بلند   تن زار میرا بھسم کر گیا

قافیے کی شوکت دیدنی ہے، لیکن یہ بھی دیکھیے کہ بظاہر اختلاف کے باوجود دونوں اشعار میں اتحاد کتنا ہے۔ دل سے وہ شعلہ اٹھا جس نے تن ضعیف و زار کو بھسم کردیا اور آسمان سے کہیں گھومتا پھرتا ایک ابر آیا جس نے اس زرد و خشک کھیتی کو نہال کردیا۔ فرق صرف یہ ہے کہ ابر کا آنا اور نہال نہال کرنا ''کرم'' تھا، اور دل سے اٹھنے والا شعلہ گھر کا بھیدی تھا، اسے تو دل کو بھسم کرنا ہی تھا۔ تو یہ سب معاملات ایک ساتھ ہوتے رہتے ہیں اور ہم انسانوں کا وجود، بلکہ ہمارا انسان پن، انھیں کا مرہون منت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ۔

میر خلاف مزاج محبت موجب تلخی کشیدن ہے   یار موافق مل جاوے تو لطف ہے چاہ مزا ہے عشق

کے باوجود، یا شاید اس کے سبب، عشق کو میر نے عام کاروبار زندگی کے درجے پر متمکن کردیا۔ یار اگر موافق نہ ہو تو زندگی زیادہ مشکل گذرتی ہے، لیکن جگر چاکی اور ناکامی خود برابر ہیں انسان کی عام زندگی کے۔ چاہ کے لطف اور عشق کے مزے کے باوجود۔

جگر چاکی ناکامی دنیا ہے آخر   نہیں آئے جو میر کچھ کام ہوگا
دل خراشی و جگر چاکی و خوں افشانی   ہوں تو ناکام پہ رہتے ہیں مجھے کام بہت

اب شاید یہ بات کچھ صاف ہونے لگی ہوگی کہ زندگی کی عام باتوں میں الیاتی قوت اور ماورائی معنی دیکھ لینے کا عمل میر کے یہاں کس طرح ظہور پذیر ہوتا ہے اور اب یہ نکتہ بھی روشن ہونے لگا ہوگا کہ اردو کا شاعر، خاص کر میر کے درجے کا شاعر صبح و شام کی معمولہ زندگی کو کس طرح اور کن معنی میں اپنے شعر میں ساتھ لے کر چلتا ہے۔ ہم لوگ اپنے گرداگرد پھیلی ہوئی سچائیوں سے زیادہ گرد و پیش کے مناظر کے دلدادہ رہے ہیں۔ ہماری نظر میں نظیر اکبرآبادی ایسے شاعر ہیں جو ''عام زندگی'' کی عکاسی کرتے ہیں۔ ہم لوگ ''میلے ٹھیلے'' کے ذکر کو عام زندگی کا ذکر سمجھتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ میلہ ٹھیلہ عام زندگی کا حصہ نہیں، تماشا ہے، جو کبھی ہوتا ہے تو کبھی نہیں بھی ہوتا۔ اس کے موسم ہیں، وقت ہیں، ٹھکانے ہیں۔ یہ سب چیزیں بھی حقیقی ہیں، لیکن یہ عام زندگی کا چھوٹا سا حصہ ہیں، روز کے معاملے نہیں۔ ہر روز عید نیست کہ حلوا خورد کسے اسی لیے کہا گیا تھا۔

میر نے جس طرح روزمرہ، بول چال کی زبان کو شعر کی زبان کا رتبہ بخش دیا تھا، اسی طرح انھوں نے روزمرہ کی بے رنگ زندگی کو مابعدالطبیعیاتی اور ماورائی دنیاؤں کے عالم میں بدل دیا۔

لے جایئے میر اس کے دروازے کی مٹی بھی　　اس درد محبت کی جو کوئی دوا جانے
ناصح نہ روئیں کیونکہ محبت کے جی کو ہم　　اے خانماں خراب ہمارے تو گھر گئے
جو ایسا ہی تم ہم کو سمجھے ہو سہل　　ہمیں بھی یہ جینا ہے دشوار سا
دکھاؤں متاع وفا کب اسے　　لگا واں تو رہتا ہے بازار سا
کس کی خوبی کے طلبگار ہیں عزت طلباں　　خر تے بکنے کو چلے آتے ہیں بازار کے بیچ
پاؤں چھاتی پہ میری رکھ چلتا　　یاں کبھو اس کا یوں گذارا تھا
مل اہل بصیرت سے کچھ دے ہی دکھادیں گے　　لے خاک کی کوئی چٹکی اکسیر بنادیں گے

یہ معمولی شعر نہیں ہیں، لیکن کلیات میر میں یہ معمولی ہیں۔ اور انھیں کی مدد سے اندازہ لگانا چاہیے کہ جہاں مناسبت اور رعایت، رمز وکنایہ، معنی پروری، طنز واشارہ کا یہ وفور معمولی اشعار میں ہو، وہاں عالی رتبہ شعروں کا کیا رنگ ہوگا۔ لیکن یہ شعر یہاں میں نے کسی اور مطلب سے نقل کیے ہیں۔ آپ ملاحظہ کریں کہ ان شعروں میں عام زندگی کے معاملات، رہن سہن، بات چیت، بحث مباحثہ، خرید وفروخت، تنگی وفراخی، ان چیزوں کو مضمون بنایا گیا ہے، یا مضمون کو ان کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ اشعار میں نے کچھ تو حافظے سے اور کچھ کلیات کے ورق الٹ پلٹ کر حاصل کیے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے بعض شعرا کے کلیات میں اس رنگ وکیفیت کے اشعار ملیں گے، مگر میر سے کم۔ اور بعد کے شعرا کے یہاں تو میدان خالی ہی ملے گا۔ مصحفی اٹھارویں اور انیسویں صدیوں کے درمیان پل کی طرح ہیں، ان کے یہاں بھی یہ رنگ مل جائے گا، لیکن اتنے تنوع کے ساتھ نہیں۔ بنیادی بات یہ ہے کہ میر کو جتنی اور جیسی دلچسپی اس بظاہر سادہ اور سرسری، غیر دانشورانہ، غیر تعقلانہ زندگی اور اس کے مظاہر سے ہے، وہ کسی اور شاعر کو نہیں۔ اور اس زندگی اور اس کے مظاہر سے جتنے معنی میر نے نکالے ہیں وہ کسی اور کے بس کی بات نہ تھے۔

میر کے نام نہاد ''بہتر'' نشتروں کا ذکر بہت کیا گیا ہے، اور افسوس کہ یہ ذکر اب بھی کہیں کہیں سننے میں آجاتا ہے۔ بھلا ستر برس کی مشق سخن، علم وفضل وتجربہ، غور وتفحص، اور آخری عمر تک شعر گوئی کی صلاحیت ویسی ہی برقرار رہنا جیسی کہ اوائل ریعان میں تھی، ان سب کو بہتر نشتروں میں کون سمیٹ سکتا ہے؟ اپنے سرمائے کی جو ناقدری ہم نے روا رکھی ہے اور تاریخ کو ہم جس طرح جھٹلاتے رہے ہیں، اس کا نتیجہ یہی ہونا تھا کہ ہم نے اپنے سب سے بڑے شاعر کی کائنات کو ہفتا دو دو ابیات میں محصور سمجھ لیا۔ بہتر نشتروں کے ایک دو مجموعے بھی میری نظر سے گذرے ہیں۔ یہی محسوس ہوا کہ ان بزرگوں نے بہتر نشتر ڈھونڈنے کا کام کسی فرض کی طرح نبھایا ہے، لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اس قدر مارے باندھے انداز میں تو وہی فرض نبھایا جاتا ہے جس میں ہمارا دل نہ ہو، بس عقیدہ ہو، جیسے ہم میں سے اکثر کے لیے ٹھنڈے ٹھار موسم میں فجر کی نماز کے لیے اٹھنا اور سرد پانی سے وضو کرنا۔ معلوم ہوا بہتر نشتروں کا تصور عقیدہ بن کر ہمارے شعور میں جاگزیں ہوگیا ہے۔

مثال کے طور پر، فاضل مشہدی صاحب نے میر کے بہتر نشتروں کا ایک مجموعہ ۱۹۳۰ یا ۱۹۳۸ میں شائع کیا۔ جو نسخہ میرے سامنے ہے اس پر طباعت کی تاریخ نہیں پڑی ہے، لیکن مصنف کے دیباچے کی تاریخ ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۷ درج ہے۔ اس کتاب میں تین شعر ایسے ہیں جو مجھے میر کے کلام میں کہیں نہیں ملے۔ لہٰذا انتخاب میں بہتر کی جگہ انہتر ہی شعر رہ گئے۔ یہ سب شعر نشتر ہیں کہ نہیں، اور اگر نشتر ہیں تو نشتر آبدار ہیں کہ نہیں، ان سوالوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اشعار کی شرحیں دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اشعار، یا مضمون کے ''نیچرل'' ہونے کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ اس انتخاب میں میر کے ساتھ کتنا انصاف کیا گیا ہوگا۔

یہ بات یہاں میں نے کئی وجہوں سے اٹھائی ہے۔ ایک تو یہ کہ آپ کے انتخاب میں بہتر شعر ہوں یا سات ہزار دو سو شعر ہوں، کوئی انتخاب میر کی وسعت اور ان کے کیف وکم کے ساتھ انصاف نہیں کرسکتا۔ دوسری بات یہ کہ انتخاب کنندہ چاہے کتنا ہی دیانت دار کیوں نہ ہو، اپنے تعصبات سے بہ تمام و کمال دامن کش نہیں ہوسکتا۔ پھر ایک بات یہ ہے کہ گذشتہ سو سوا سو برس سے ہمارے عام اساتذہ اور اصحاب رائے کا تعصب ''نیچرل شاعری'' کی پوری موافقت میں، اور کلاسیکی شاعری کی محض مشروط موافقت میں کام کرتا رہا ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ میر انتخاب کے شاعر ہیں۔ انتخاب کے شاعر نظیر اکبرآبادی اور مصحفی اور آتش و ذوق ہیں۔ غالب بھی انتخاب کے شاعر ہیں۔ ان سب شعرا کو انتخاب سے فائدہ پہنچے گا یا پہنچ چکا ہے۔ غالب کی مثال سامنے کی ہے۔ میر انیس اور اقبال کی طرح میر کلیات کے شاعر ہیں۔

یہاں میر انیس کے ذکر سے آپ کو تعجب نہ ہونا چاہیے۔ افسوس کہ انیس کے تمام کلام کا متن پوری طرح متعین اور مدون نہیں ہوا ہے، لیکن جو بھی مرثیہ میر انیس کا آپ پڑھیں، آپ کو محسوس ہوگا کہ کسی نہ کسی وجہ سے یہ مرثیہ انیس کے ان تمام مرثیوں سے مختلف ہے جو آپ پڑھ چکے ہیں۔ اور مختلف ہونے کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ اس میں گذشتہ مرثیوں سے مختلف کردار یا روایات کو پیش کیا گیا ہے۔ میر کا بھی یہی معاملہ ہے کہ ان کے کسی شعر کے بارے میں آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ بیکار ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوگا کہ اکیلا شعر واہیات معلوم ہوگا لیکن جب اسے غزل میں رکھ کر دیکھیں گے تو گرد و پیش کے اشعار کی وجہ سے اس میں کوئی لطف، یا معنویت نظر آجائے گی۔ کبھی کبھی (بلکہ شاید اکثر) ایسا ہوگا کہ اکیلا شعر انتہائی زبردست معلوم ہوگا، لیکن آپ جب اسے غزل یا دیوان میں رکھ کر دیکھیں گے تو گرد و پیش ایسے بہت سے شعر ملیں گے جو اس سے ذرا انیس یا ذرا بیس ہوں گے اور وہی شعر جو تنہا آپ کو بے حد غیر معمولی لگ رہا تھا اب تاروں کے جھرمٹ میں ایک تارا دکھائی دے گا اور پھر آپ کو اس بات پر تعجب نہ ہوگا کہ دیوان یا کلیات کا مطالعہ کرتے وقت وہ شعر آپ سے نظر انداز ہوگیا تھا۔

ایک مدت ہوئی میں نے لکھا تھا کہ میر کے خراب شعر بھی اہمیت رکھتے ہیں، کہ وہ میر ہی کی طرح کے خراب شعر ہیں، ہما شما کی طرح کے خراب شعر نہیں ہیں۔ محمد حسن عسکری نے ایک اور بات کہی تھی کہ میر کے خراب شعر کے بارے میں بھی غور کرلینا چاہیے کہ شاعر نے اس میں دنیا کا کون سا تجربہ، زندگی کے بارے میں کون سی بات رکھ دی ہے۔ عسکری صاحب کا نکتہ درست تو ہے، لیکن وہ ہمیں بہت دور تک نہیں لے جاتا، کیونکہ اٹھارویں صدی کے کم و بیش ہر اردو شاعر نے زندگی کے براہ راست تجربے پر مبنی باتیں کثرت سے کہی ہیں۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ میر کے کون سے شعر آج کے مذاق پر گراں گذرتے ہیں۔ (یہ بات دیگر ہے کہ آج کے لوگوں کا مذاق انگریزی سے متاثر ہے، اس معنی میں کہ لفظ سے زیادہ خیال پر

زور دینا ہم نے بزعم خود مغرب سے سیکھا ہے۔) خیر، تو جب ہم اس سوال کا جواب ڈھونڈیں کہ میر کے کون سے شعر آج کے مذاق کو ناگوار ہیں، تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ سب شعر وہ ہیں جن کا مضمون نئے مذاق پر بار ہوتا ہے، یعنی آج کے لوگ میر کے ان شعروں کو ناپسند کرتے ہیں جو ان کے خیال میں سفیہانہ، یا عامیانہ، یا پیش پا افتادہ مضامین پر مبنی ہیں، یا ان میں رعایت لفظی یا تصنع ہے۔ بلکہ سچ پوچھیے تو رعایت لفظی اور تصنع والی بات بھی مضمون کی ہی متابعت میں ہے، کیونکہ جن اشعار کا مضمون لوگوں کو پسند آتا ہے ان میں اگر رعایت (یا بقول بعض تصنع) وغیرہ بھی ہو تو آج کے لوگ اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر، مندرجہ ذیل شعر کے دونوں مصرعوں میں ''دیکھنا'' کو بطریق ایہام برتا گیا ہے، لیکن اس شعر کو سب پسند کریں گے، اور شاید ہی کوئی اعتراض کرے گا کہ اس شعر میں ایہام جیسی ''قبیح'' صنعت استعمال ہوئی ہے۔

سنتے تھے کہ جاتی ہے ترے دیکھنے سے جاں اب جان چلی جاتی ہے ہم دیکھتے ہیں ہائے

اب ایک اور شعر دیکھیے، آج شاید ہی کوئی ایسا ہو جو اسے دیکھ یا سن کر لاحول نہ پڑھے۔

یاں پلیتھن نکل گیا واں غیر اپنی تکی لگائے جاتا ہے

سبھی کہیں گے، صاحب کیا پست مضمون ہے، اور کیسی بھونڈی رعایت لفظی ہے، ''پلیتھن'' اور ''تکی'' کتنا برا معلوم ہوتا ہے، وغیرہ۔ لیکن واقعہ تو یہی ہے کہ رعایت اس لیے بری لگ رہی ہے کہ مضمون ہمارے من پسند نہیں۔ اب ذرا رک کر مزید غور کریں۔ کیا ضرور ہے کہ اسے عاشق صادق کی ناکامی اور نارسائی اور رقیب بوالہوس کی کامیابی اور رسائی پر مبنی ''درد ناک'' شعر قرار دیا جائے؟ یہ شعر مزاحیہ بھی تو ہوسکتا ہے۔ اور اگر اسے مزاحیہ قرار دیں تو اس حیثیت میں اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو معنی آفرینی کا پہلو ہے، کہ ''پلیتھن نکل جانا'' بمعنی ''برا حال ہونا'' اور ''پلیتھن پکانا'' بمعنی ''تباہی کا سامان کرنا، یا تباہ کر ڈالنا'' ہیں، اور ''تکی لگانا'' بمعنی ''تعلق قائم کرنا، مطلب حاصل کرنا'' ہے۔ لہٰذا دونوں محاوروں کو مزاحیہ رنگ میں برتا گیا ہے۔ اور دوسرا پہلو خود پر ہنسنے کا ہے، کہ اپنی زبوں حالی، بیچارگی اور نارسائی کے مقابلے میں رقیب کی کامگاری ہے، لیکن اسے اس طرح بیان کیا ہے گویا یہ بات موجب ظرافت ہو۔

اب وہی بات سامنے آتی ہے کہ میر کے خراب شعر بھی ہیں تو وہ میر ہی کی طرح کے ہیں۔ مثلاً میر کے یہاں ڈھیلی، سست بندش والا شعر ایک نہ ملے گا۔ نہ ہی میر کے پورے کلیات میں آپ کو دولخت شعر ملے گا، نہ ایسا شعر ملے گا جس میں ایک مصرع بہت عمدہ ہو اور دوسرا پھسپھسا ہو۔ اسی طرح، بھرتی کے الفاظ میر کے اکادکا شعر (خاص کر غزل کے شعر) میں ملیں تو ملیں۔ اس کے لیے آپ کو بہت کاوش کرنی ہوگی۔ میر کے یہاں آپ کو کمزور یا نامناسب استعارے اور تشبیہیں نہیں ملیں گی۔ اور حسن یا روانی سے عاری، بلکہ کم روانی والا شعر تو میر کے یہاں آپ کو ساری عمر کی تلاش کے بعد بھی نہ ملے گا۔ کہنے کو تو یہ بات آسانی سے کہہ دی جاتی ہے کہ میر کے یہاں پست و بلند بہت ہے، لیکن اس بات پر توجہ نہیں ہوتی کہ خالص فن شعر کے اعتبار سے دیکھیں تو میر کا شعر خال خال ہی ایسا ہوگا جسے عیب دار کہا جاسکے۔ اور ان عیب دار شعروں میں بھی بعض ایسے ہوں گے جن میں سقوط عین یا سقوط ہائے ہوز ہے، جو اس زمانے میں اگر عام نہیں تو جائز ضرور تھا۔

ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ میر کے زمانے میں جو خوبی کے معیار تھے ان میں سے کچھ کو ہم نے جدید فیشن کے زیر اثر ترک کر دیا۔ یا یوں کہیں کہ اپنے احساس شعر سے خارج کر دیا۔ اپنے کچھ نئے معیار بھی ہم نے میر، اور میر ہی کیوں تمام کلاسیکی شعرا پر جاری کر دیے۔ فاضل مشہدی ہزار سادہ رہے ہوں لیکن وہ اس حقیقت سے واقف تھے۔ انھوں نے لکھا ہے میر

کے زمانے میں تو ''اشعار عموماً محاورہ بندی، ایہام گوئی، درستی زبان'' پر بنی کہے جاتے تھے، ''مگر آج جس بات پر لوگ جان دیتے ہیں وہ نیچرل شاعری ہے''۔ لہٰذا ہم لوگوں نے میر کو اپنے معیاروں پر جانچا، اور اس کارگزاری سے میر کا کچھ نقصان تو ہوا، لیکن زیادہ نقصان ہم ہی لوگوں کا ہوا۔ میر کا تو نقصان صرف اتنا ہوا کہ کوئی سو برس سے ان کے بارے میں یہ جھوٹ مشہور ہوگیا کہ ان کا بہت سارا کلام ''پست'' (یعنی نیچرل شاعری اور ''حقیقت نگاری'' کے معیاروں سے ساقط) ہے۔ اس افواہ کو تقویت ایک اور افواہ سے ملی کہ شیفتہ جیسے جید آدمی نے میر کا محاکمہ یوں کیا ہے کہ ''پستش بغایت پست و بلندش بسیار بلند''۔ شیفتہ نے لکھا تو یہ تھا (اور وہ بھی آزردہ کے حوالے سے) کہ ''پستش اگرچہ اندک پست اما بلندش بسیار بلند'' (ملاحظہ ہو ''گلشن بیخار''، مطبوعہ دہلی، ۱۹۴۳، صفحہ ۱۴۹)، لیکن افواہ جتنی جھوٹی ہو اتنی ہی توانا اور دیرپا ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ آج اگرچہ آزردہ/شیفتہ کا صحیح قول بار بار نقل کیا جاچکا ہے، پھر بھی عام خیال یہی ہے کہ شیفتہ نے میر کے بارے میں ''پستش بغایت پست'' لکھا تھا۔

جیسا کہ میں نے اوپر کہا، میر کے بارے میں غلط تنقیدی رائے کی شہرت نے میر کو ذرا ہی سا نقصان پہنچایا۔ ''پستش بغایت پست'' کی شہرت کے باوجود میر بہرحال خدائے سخن کی مسند پر متمکن رہے۔ اور عینی طور پر دیکھیے تو ان کے کلام کا رتبہ اس رائے کی وجہ سے پست تو ہوا نہیں، وہ تو وہیں کا وہیں کلیات میں محفوظ، اور کسی اچھے شعر فہم کا منتظر رہا۔ لیکن ہم لوگوں کا نقصان بہت زیادہ ہوا۔ ایک تو یہ کہ ہم نے میر کے بہت سے اشعار کو سمجھا ہی نہیں، اور بہت سے اشعار کو غلط سمجھا۔ ہمارا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ رطب و یابس کی کثرت اور کلیات کی طوالت کے (بے بنیاد، لیکن حقیقی) خوف کے سبب ہم لوگوں نے میر کا کلیات پڑھا ہی نہیں، اور اس طرح ان کے بہت سے نہایت عمدہ شعر (یعنی ایسے شعر جن کا جادو ہمارے تعصب کے باوجود سر پر چڑھ کر بولتا) ہماری نظر سے اوجھل رہے۔ ناصر کاظمی کے بارے میں کہتے ہیں کہ جب وہ میر کے اشعار اپنے احباب کو سناتے تو لوگ متعجب ہوکر پوچھتے کہ یہ شعر کون سے انتخاب میر میں ہیں؟ اثر لکھنوی، محمد حسن عسکری، سردار جعفری اور خود ناصر کاظمی کے انتخابات نے میر کے بارے میں صحیح تر تنقیدی رویوں کو پروان چڑھانے میں مدد کی، لیکن انتخاب پھر انتخاب ہے، اور میر بہرحال کلیات کے شاعر ہیں۔ یہاں یہ بات تسلیم کرنی چاہیے کہ میر کا کوئی اچھا کلیات بھی بازار میں نہ تھا جس سے شائقین مستفید ہوسکتے۔ ہمیں ظل عباس عباسی مرحوم کا احسان مند ہونا چاہیے کہ انھوں نے غزلوں کا بڑی حد تک معتبر کلیات ۱۹۶۸ میں علمی مجلس دہلی سے شائع کیا۔ اسی کو مزید اصلاح و درستی کے بعد ترقی اردو بورڈ، حکومت ہند (اب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان)، نئی دہلی نے چھاپا، اور اب اس کا نیا ایڈیشن مزید تصحیح و اضافہ کے بعد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اب اس سوال پر کچھ مزید غور ہوسکتا ہے کہ میر نے ہر کس و ناکس سے اپنی عظمت کا لوہا کیونکر منوایا۔ ایک بات تو یہی ہے کہ ''خدائے سخن'' کا خطاب جو انھیں جمہور اردو نے نئے زمانے کے پہلے عطا کیا تھا، وہ بہرحال قائم رہا۔ کسی نے اس بات میں شک کیا ہو تو کیا ہو کہ میر خدائے سخن واقعی ہیں کہ نہیں، لیکن میر ہمارے عظیم شاعر ہیں، اتنا تو انھوں نے بھی تسلیم کیا جو میر کو خدائے سخن ماننے میں تردد رکھتے۔ لیکن یہ بات تو ادبی تہذیب اور ادبی معاشرے کی نفسیات سے تعلق رکھتی ہے۔ اور خدائے سخن والی دلیل میں دور لازم آتا ہے، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ لہٰذا کیا کوئی معروضی باتیں بھی میر کی عالم گیر مقبولیت کے سلسلے میں کہی جاسکتی ہیں؟

تو یہاں پہلا نکتہ تو یہ ہے کہ میر کے کلام کا انتخاب بنانے والوں کی ناانصافیوں یا تعصب کے باوجود یہ بات ظاہر اور ثابت رہی کہ روزمرہ کے معاملات حیات کو برتنے کے ساتھ ساتھ عشق کی زندگی جینے سے جو سروکار میر نے رکھا، اور چھوٹی

چھوٹی باتوں سے بڑے مطالب میر نے جس طرح نکالے، وہ بات اوروں کے یہاں نہیں ہے، اور اگر کسی کے یہاں ہے بھی (مثلاً میر اثر اور میر حسن کی غزلوں میں) تو اس تنوع اور رنگارنگی سے نہیں ہے۔ میر کا کلام پڑھیے تو لگتا ہے یہ باتیں اسی لیے خلق ہوئی تھیں کہ میر کے شعر میں انھیں جگہ ملے۔ مثلاً بابائے اردو مولوی عبدالحق کا انتخاب بہت اچھا نہیں ہے، اگرچہ یہ اولین اشاعت (۱۹۳۷) سے لے کر آج تک بہت مقبول رہا ہے۔ بابائے اردو کے انتخاب میر کی ورق گردانی کریں تو شروع کے دس صفحوں میں ہی اس طرح کے شعر بے تکلف دکھائی دیتے ہیں۔

کھیل لڑکوں کا سمجھتے تھے محبت کے تئیں　　　ہے بڑا حیف ہمیں اپنی بھی نادانی کا

بلبلوں نے کیا گل افشاں میر کا مرقد کیا　　　دور سے آیا نظر تو پھولوں کا اک ڈھیر تھا

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا　　　چھوڑا وفا کو ان نے مروت کو کیا ہوا

تھے برے مغبچوں کے تیور لیک　　　شیخ مےخانے سے بھلا کھسکا

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے ہو　　　ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

موجیں کرے ہے بحر جہاں میں ابھی تو تو　　　جانے گا بعد مرگ کہ عالم حباب تھا

ان میں سے پانچویں کے علاوہ کوئی شعر ایسا نہیں جسے بڑا شعر کہہ سکیں۔ لیکن ان سب شعروں میں یہ غیر معمولی بات ہے کہ وہ ایسی باتوں پر مبنی ہیں جو عام گفتگو، تبادلۂ خیال، آپس کی رائے زنی کے دوران سنائی دیتی ہیں۔ کوئی مضمون دور کا نہیں ہے، لہجہ عام بول چال کے بہت قریب ہے، اور ایک لمحے کے لیے یہ بھول جائیں کہ یہ بیانات وزن میں ہیں (یعنی بحر و وزن کے اعتبار سے ''موزوں'' ہیں) تو یہ ایسے جملے معلوم ہوں گے جو ہم اپنے معاشرے میں روزانہ بولتے اور سنتے ہیں۔ اور پھر بھی یہ شعر ہیں، بلکہ بابائے اردو (اور لاتعداد پڑھنے والوں) کی رائے مانی جائے تو بہت اچھے شعر ہیں۔ میر کے کلیات غزل میں کوئی پندرہ ہزار شعر ہیں۔ بابائے اردو کے انتخاب غزلیات میں کوئی اٹھارہ سو شعر ہیں۔ لہٰذا یہ انتخاب خاصا سخت ہے، اور اس انتخاب کی رو سے مندرجہ بالا اشعار میر کے بہترین شعروں میں ہیں۔ چلیے اتنا نہ سہی، یہ تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ اچھے، اوسط درجے کے شعر ہیں۔ تو ذرا کسی اور کا کلیات دیکھ ڈالیے، کس کے کلام میں اتنی کثرت سے ایسے شعر ملیں گے جو نک سک سے درست ہوں اور جن میں ایسی باتیں ہوں جنھیں ہم پہچان سکیں کہ ہمارے گرد و پیش اٹھنے والی باتیں ہیں؟ محمد حسین آزاد نے ''آب حیات'' میں کچھ بھی لکھا ہو، کہ میر کو یہ بھی خبر نہ ہوتی تھی کہ ان کی کھڑکی کے پیچھے باغ ہے، لیکن یہ شعر اس شخص کے کہے ہوئے ہیں جسے عام انسانی زندگی اور عام لوگوں کی معاشرتی اقدار سے اتنی دلچسپی ہے کہ یہ چیزیں اس کے کلام میں جابجا چمک اٹھتی ہیں۔ ان شعروں کے خالق سے مجلسیں اور محفلیں بھی اتنی ہی آباد رہی ہیں جتنے کہ خلوت خانے اور حبس دم کے حجرے اس کے وجود سے گرم رہے ہیں۔

آج کل لوگ اکثر پوچھ دیتے ہیں، صاحب، اس شاعر نے ہمارے لیے کیا پیغام دیا ہے؟ میر کے زمانے میں میر سے یہ سوال پوچھا جاتا تو وہ تیوری پر بل لاتے اور چپ رہتے۔ لیکن اگر وہ آج ہوتے اور اس کلیات کی رسم اجرا کے موقعے پر کوئی جیالا ان سے پوچھ ہی بیٹھتا تو ان کا جواب شاید یہ ہوتا کہ ہم نے مجلس آفاق بھی گرم کی، جل بھی بجھے، اور اسی جل بجھنے میں اپنی شام کو سحر کر دیا۔ ہو سکے تو تم بھی یہی کر دیکھو۔

●●●